پڑیے گر بیمار

مشتاق احمد یوسفی

تو کوئی نہ ہو تیماردار؟ جی نہیں! بھلا کوئی تیماردار نہ ہو تو بیمار پڑنے سے فائدہ؟ اور اگر مرجائیے تو نوحہ خواں کوئی نہ ہو؟ توبہ کیجئے! مرنے کا یہ اکل کھرا دقیانوسی انداز مجھے کبھی پسند نہ آیا۔ ہوسکتا ہے غالب کے طرفدار یہ کہیں کہ مغرب کو محض جینے کا قرینہ آتا ہے، مرنے کا سلیقہ نہیں آتا۔ اور سچ پوچھئے تو مرنے کا سلیقہ کچھ مشرق ہی کا حصہ ہے۔ اسی بنا پر غالبؔ کی نفاست پسند طبیعت نے ۱۲۷۷ھ میں وبائے عام میں مرنا اپنے لائق نہ سمجھا کہ اِس میں اُن کی کسرِ شان تھی۔ حالانکہ اپنی پیشن گوئی کو صحیح ثابت کرنے کی غرض سے وہ اسی سال مرنے کے آرزومند تھے۔

اس میں شک نہیں کہ ہمارے ہاں باعزّت طریقے سے مرنا ایک حادثہ نہیں، ہُنر ہے جس کے لیے عمر بھر ریاض کرنا پڑتا ہے۔ اور اللہ اگر توفیق نہ دے تو یہ ہر ایک کے بس کا روگ نہیں۔ بالخصوص پیشہ ور سیاستدان اس کے فنّی آداب سے واقف نہیں ہوتے۔ بہت کم لیڈر ایسے گزرے ہیں جنھیں صحیح وقت پر مرنے کی سعادت نصیب ہوئی۔ میرا خیال ہے کہ ہر لیڈر کی زندگی میں، خواہ کتنا ہی گیا گزرا کیوں نہ ہو، ایک وقت ضرور آتا ہے جب وہ ذرا جی کڑا کر کے مرجائے یا اپنے سیاسی دُشمنوں کو رِشوت دے کر اپنے آپ کو شہید کرالے تو وہ لوگ سال کے سال نہ سہی، ہر الیکشن پر ضرور دھوم دھام سے اس کا عُرس منایا کریں۔ البتّہ دِقّت یہ ہے کہ اس قسم کی سعادت دوسرے کے زورِ بازو پر منحصر ہے اور سعدیؔ کہہ گئے ہیں کہ دوسرے کے بل بوتے پر جنّت میں جانا عقوبتِ دوزخ کے برابر ہے۔ پھر اِس کا کیا علاج کہ انسان کو موت ہمیشہ قبل اَز وقت اور شادی بعد اَز وقت معلوم ہوتی ہے۔

بات کہاں سے کہاں جا پہنچی۔ ورنہ سردست مجھے ان خوش نصیب جواں مرگوں سے سروکار نہیں جو جینے کے قرینے اور مرنے کے آداب سے واقف ہیں۔ میرا تعلق تو اُس مظلوم اکثریت سے ہے جس کو بقول شاعر

جینے کی ادا یاد، نہ مرنے کی ادایاد

چنانچہ اِس وقت میں اُس بے زبان طبقہ کی ترجمانی کرنا چاہتا ہوں جو اُس درمیانی کیفیت سے گزر رہا ہے جو موت اور زندگی دونوں سے زیادہ تکلیف دہ اور صبر آزما ہے۔ یعنی بیماری! میرا اشارہ اُس طبقہ کی طرف ہے جسے

سب کچھ اللہ نے دے رکھا ہے صحّت کے سوا

میں اُس جسمانی تکلیف سے بالکل نہیں گھبراتا جو لازمۂ علالت ہے۔ اسپرین کی صرف ایک گولی یا مارفیا کا ایک انجکشن اس سے نجات دلانے کے لیے کافی ہے۔ لیکن اس روحانی اذّیت کا کوئی علاج نہیں جو عیادت کرنے والوں سے مسلسل پہنچتی رہتی ہے۔ ایک دائمُ المرض کی حیثیت سے جو اس دردِ لادوا کی لذّت سے آشنا ہے، میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ مارفیا کے انجکشن مریض کے بجائے مزاج پُرسی کرنے والوں کے لگائے جائیں تو مریض کو بہت جلد سکون آجائے۔

اردو شاعروں کے بیان کو باور کیا جائے تو پچھلے زمانے میں علالت کی غایت ''تقریبِ بہرِ ملاقات'' کے سوا کچھ نہ تھی۔ محبوب عیادت کے بہانے غیر کے گھر جاتا اور ہر سمجھ دار آدمی اسی اُمید میں بیمار پڑتا تھا کہ شاید کوئی بھولا بھٹکا مزاج پُرسی کو آنکلے۔

علالت بے عیادت جلوہ پیدا کر نہیں سکتی

اس زمانے کے اندازِ عیادت میں کوئی دل نوازی ہو تو ہو، میں تو اُن لوگوں سے ہوں جو محض عیادت کے خوف سے تندرُست رہنا چاہتے ہیں۔ایک حسّاس دائمُ المرض کے لیے ''مزاج اچھا ہے؟،، ایک رسمی یا دُعائیہ جملہ نہیں بلکہ ذاتی حملہ ہے جو ہر بار اُسے احساسِ کمتری میں مبتلا کردیتا ہے۔میں تو آئے دن کی پُرسشِ حال سے اِس قدر بے زار ہوچکا ہوں کہ احباب کو آگاہ کردیا ہے کہ جب تک میں بقلم خود یہ اِطّلاع نہ دوں کہ آج اچھا ہوں۔مجھے حسبِ معمول بیمار ہی سمجھیں اور مزاج پُرسی کرکے شرمندہ ہونے کا موقع نہ دیں۔

سُنا ہے کہ شائستہ آدمی کی یہ پہچان ہے کہ اگر آپ اُس سے کہیں کہ مجھے فلاں بیماری ہے تو وہ کوئی آزمودہ دوا نہ بتائے۔شائستگی کا یہ سخت معیار تسلیم کرلیا جائے تو ہمارے ملک میں سوائے ڈاکٹروں کے کوئی اللہ کا بندہ شائستہ کہلانے کا مستحق نہ نکلے۔یقین نہ آئے تو جھوٹ موٹ کسی سے کہہ دیجئے کہ مجھے زُکام ہوگیا ہے۔پھر دیکھئے، کیسے کیسے مجرّب نسخے، خاندانی چٹکلے اور فقیری ٹوٹکے آپ کو بتائے جاتے ہیں۔میں آج تک یہ فیصلہ نہ کرسکا کہ اس کی اصل وجہ طبّی معلومات کی زیادتی ہے یا مذاقِ سلیم کی کمی۔بہرحال بیمار کو مشورہ دینا ہر تندرُست آدمی اپنا خوشگوار فرض سمجھتا ہے اور انصاف کی بات یہ ہے کہ ہمارے ہاں ننانوے فی صد لوگ ایک دوسرے کو مشورے کے علاوہ اور دے بھی کیا سکتے ہیں؟

بعض اوقات احباب اس بات سے بہت آزُردہ ہوتے ہیں کہ میں ان کے مشوروں پر عمل نہیں کرتا۔حالانکہ ان پر عمل پیرا نہ ہونے کا واحد سبب یہ ہے کہ میں نہیں چاہتا کہ میرا خون کسی عزیز دوست کی گردن پر ہو۔اس وقت میرا منشا صلاح ومشورہ کے نقصانات گنوانا نہیں (اس لیے کہ میں دماغی صحت کے لیے یہ ضروری سمجھتا ہوں کہ انسان کو پابندی سے صحیح غذا اور غلط مشورہ ملتا رہے۔اسی سے ذہنی توازُن قائم رہتا ہے) نہ یہاں ستم ہائے عزیزاں کا شکوہ

مقصود ہے ۔ مدّعا صرف اپنے اُن بہی خواہوں کو متعارّف کرانا ہے جو میرے مُزمِن امراض کے اسباب وعلل پر غور کرتے اوراپنے مشورے سے وقتاً فوقتاً مجھے مستفید فرماتے رہتے ہیں ۔اگر اس غول میں آپ کو کچھ جانی پہچانی صورتیں نظر آئیں تو میری خستگی کی داد دینے کی کوشش نہ کیجئے ،آپ خود لائقِ ہمدردی ہیں ۔

سرِفہرست اُن مزاج پُرسی کرنے والوں کے نام ہیں جو مرض کی تشخیص کرتے ہیں نہ دوا تجویز کرتے ہیں ۔مگر اِس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ منکرِمزاج ہیں ۔دراصل اُن کا تعلق اُس مدرسۂ فکر سے ہے جس کے نزدیک پرہیز علاج سے بہترہے ۔ یہ اِس شکم آزار عقیدے کے مُبلّغ و مُویّد ہیں کہ کھانا جتنا پھیکا سیٹھا ہوگا، صحت کے لیے اُتنا ہی مفید ہوگا۔یہاں یہ بتانا بے محل نہ گا کہ ہمارے ملک میں دواؤں کے خواص دریافت کرنے کا بھی یہی معیار ہے ۔ جس جس طرح بعض خوش اعتقاد لوگوں کا ابھی تک یہ خیال ہے کہ ہر بدصورت عورت نیک چلن ہوتی ہے،اسی طرح طبِّ قدیم میں ہر کڑوی چیز کو مُصفّیِ خُون تصوّر کیا جاتا ہے ۔چنانچہ ہمارے ہاں انگریزی کھانے اور کڑوے قدحے اِسی اُمّید میں نوشِ جان کیے جاتے ہیں ۔

اِس قبیل کے ہمدردانِ صحت دو گروہوں میں بٹ جاتے ہیں ۔ ایک وہ غذا رسیدہ بزرگ جو کھانے سے علاج کرتے ہیں ۔ دوسرے جو علاج اور کھانے دونوں سے پرہیز تجویز فرماتے ہیں ۔پچھلی گرمیوں کا واقعہ ہے کہ میری بائیں آنکھ میں گوہانجنی نکلی تو ایک نیم جان جو خود کو پورا حکیم سمجھتے ہیں، چھوٹتے ہی بولے :

'' فمِ معدہ پر وَرَم معلوم ہوتا ہے ۔ دونوں وقت مونگ کی دال کھائیے ۔ دافِع نفخ و مُحلِلِ وَرَم ہے ۔''

میں نے پوچھا ''آخر آپ کو میری ذات سے کون سی تکلیف پہنچی جو یہ مشورہ دے رہے ہیں؟''

فرمایا ''کیا مطلب؟

عرض کیا ''دو چار دن مونگ کی دال کھا لیتا ہوں تو اُردو شاعری سمجھ میں نہیں آتی اور طبیعت بے تحاشا تجارت کی طرف مائل ہوتی ہے۔ اِس صورت میں خدانخواستہ تندرست ہو بھی گیا تو جی کے کیا کروں گا؟''

بولے ''آپ تجارت کو اِتنا حقیر کیوں سمجھتے ہیں؟ انگریز ہندوستان میں داخل ہوا تو اُس کے ایک ہاتھ میں تلوار اور دوسرے میں ترازُو تھی۔''

گزارش کی ''اور جب وہ گیا تو ایک ہاتھ میں یونین جیک تھا اور دوسری آستین خالی لٹک رہی تھی۔''

بات اُنھیں بہت بُری لگی۔ اس لیے مجھے یقین ہوگیا کہ سچ تھی۔ اس کے بعد تعلُّقات اتنے کشیدہ ہوگئے کہ ہم نے ایک دوسرے کے لطیفوں پر ہنسنا چھوڑدیا۔ استعارہ و کنایہ برطرف، میرا اپنا عقیدہ تو یہ ہے کہ جب تک آدمی کو خواص کی غذا ملتی رہے، اُسے غذا کے خواص کے بکھیڑے میں پڑنے کی مطلق ضرورت نہیں۔ سچ پوچھیے تو عمدہ غذا کے بعد کم ازکم مجھے تو بڑا انشراح محسوس ہوتا ہے اور بے اختیار جی چاہتا ہے کہ بڑھ کر ہر راہ گیر کو سینے سے لگالوں۔ دوسرا گروہ قوّتِ ارادی سے دوا اور غذا کا کام لینا چاہتا ہے اور جسمانی عوارض کے علاج معالجہ سے پہلے دماغ کی اصلاح کرنا ضروری سمجھتا ہے۔ یہ حضرات ابتدائے مرض ہی سے دوا کے بجائے دُعا کے قائل ہیں اور ان میں بھاری اکثریت ان ستّرے بہتّرے بزرگوں کی ہے جو گھگھیا گھگھیا کر اپنی درازیٔ عمر کی دعا مانگتے ہیں اور اسی کو عین عبادت سمجھتے ہیں۔ اس روحانی غذا کے لیے میں فی الحال اپنے آپ کو تیار نہیں پاتا۔ مجھے اِس پر قطعاً تعجُّب نہیں ہوتا کہ ہمارے ملک میں پڑھے لکھے لوگ خونی پیچش کا علاج گنڈے تعویذوں سے کرتے ہیں۔ غُصّہ اس بات پر آتا ہے کہ وہ واقعی اچھّے ہوجاتے ہیں۔

کچھ ایسے عیادت کرنے والے بھی ہیں جن کے اندازِ پُرسش سے ظاہر ہوتا ہے کہ بیماری ایک سنگین جرم ہے اور وہ کسی آسمانی ہدایت کے بموجب اس کی تفتیش پر مامور کیے گئے ہیں۔ پچھلے سال جب انفلوئنزا کی وبا پھیلی اور میں بھی صاحبِ فراش ہوگیا تو ایک ہمسائے جو کبھی پھٹکتے بھی نہ تھے، کمرۂ علالت میں بہ نفس نفیس تشریف لائے اور خوب کُرید کُرید کر جِرح کرتے رہے۔ بالآخر اپنا منہ میرے کان کے قریب لاکر رازدارانہ انداز میں کچھ ایسے نجی سوالات کیے جن کے پوچھنے کا حق میری ناچیز رائے میں بیوی اور منکرنکیر کے علاوہ کسی کو نہیں پہنچتا۔

ایک بزرگوار ہیں جن سے صرف دوران علالت میں ملاقات ہوتی ہے۔ اس لیے اکثر ہوتی رہتی ہے۔ موصوف آتے ہی برس پڑتے ہیں اور گرجتے ہوئے رُخصت ہوتے ہیں۔ پچھلے ہفتے کا ذکر ہے۔ ہلہلا کر بخار چڑھ رہا تھا کہ وہ آدھمکے کپکپاکر کہنے لگے:

'' بیماری آزادی میں بھی بڑی غیرسنّت برتتے ہو، برخوردار! دو گھنٹے سے ملیریا میں چُپ چاپ مبتلا ہو اور مجھے خبر تک نہ کی۔

بہترا چاہا کہ اِس دفعہ اُن سے پوچھ ہی لوں کہ ''قبلۂ کونین! اگر آپ کو بروقت اطلاع کرا دیتا تو آپ میرے ملیریا کا کیا بگاڑ لیتے؟''

اُن کی زبان اُس قینچی کی طرح ہے جو چلتی زیادہ ہے اور کاٹتی کم۔ ڈانٹنے کا انداز ایسا ہے کہ جیسے کوئی کُودَن لڑکا زور زور سے پہاڑے یاد کررہا ہو۔ مجھے ان کی ڈانٹ پر ذرا غُصّہ نہیں آتا۔ کیونکہ اب اس کا مضمون اَزبر ہوگیا ہے۔ یوں بھی اس کینڈے کے بزرگوں کی نصیحت میں سے ڈانٹ اور ڈاڑھی کو علیحدہ کردیا جائے، یا بصورت نقصِ امن، ڈانٹ میں سے ڈنک نکال دیا جائے تو بقیہ بات (اگر کوئی چیز باقی رہتی ہے) نہایت لغو معلوم ہوگی۔

اُن کا آنا فرشتۂ موت کا آنا ہے۔ مگر مجھے یقین ہے کہ حضرت عزرائیل علیہ السّلام روح قبض کرتے وقت اتنی ڈانٹ ڈپٹ نہیں کرتے ہوں گے۔ زُکام انھیں نمونیہ کا پیش خیمہ دکھائی دیتا ہے اورخسرہ میں ٹائیفائڈ کے آثار نظر آتے ہیں۔ ان کی عادت ہے کہ جہاں محض سیٹی سے کام چل سکتا ہے، وہاں بے دھڑک بِگُل بجا دیتے ہیں۔ مختصر یہ کہ ایک ہی سانس میں خدانخواستہ سے اِنّا لِلّٰہ تک کی تمام منزلیں طے کر لیتے ہیں۔ اُن کی منظوم ڈانٹ کی تمہید کچھ اِس قسم کی ہوتی ہے:

'' میاں! یہ بھی کوئی انداز ہے کہ گھر کے رئیسوں کی طرح

نبض پر ہاتھ دھرے منتظرِ فردا ہو

بیکاری بیماری کا گھر ہے۔ شاعر نے کیا خوب کہا ہے:

بیمار مباش کچھ کیا کر۔''

مصرع کا جواب شعر سے دیتا ہوں:

کمزور میری صحّت بھی، کمزور مری بیماری بھی
اچھا جو ہوا کچھ کر نہ سکا، بیمار ہوا تو مر نہ سکا

یہ سُن کر وہ بِپھر جاتے ہیں اور اپنے سِن و سال کی آڑ لے کر کوثر و تسنیم میں دُھلی ہوئی زبان میں وہ بے نقط سُناتے ہیں کہ زندہ تو درکنار، مُردہ بھی ایک دفعہ کفن پھاڑ کر سوال و جواب کے لیے اُٹھ بیٹھے۔ تقریر کا لُبِّ لُباب یہ ہوتا ہے کہ راقمُ الحروف جان بوجھ کر اپنی تندرستی کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑا ہے۔ میں اُنھیں یقین دلاتا ہوں کہ اگر خودکُشی میرا منشا ہوتا تو یوں ایڑیاں رگڑ رگڑ کر نہیں جیتا، بلکہ آنکھ بند کر کے اُن کی تجویز کردہ دوائیں کھالیتا۔

آئیے، ایک اور مہربان سے آپ کو ملاؤں۔ اُن کی تکنیک قدرے مختلف ہے۔ میری صورت دیکھتے ہی ایسے ہراساں ہوتے ہیں کہ کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ اُن کا معمول ہے کہ کمرے میں بغیر کھنکھٹائے داخل ہوتے ہیں اور میرے سلام کا جواب دیئے بغیر تیمارداروں کے پاس پنجوں کے بل جاتے ہیں۔ پھر کھُسر پھُسر ہوتی ہے۔ البتّہ کبھی کبھی کوئی اُچٹتا ہوا فقرہ مجھے بھی سُنائی دے جاتا ہے۔ مثلاً:

'' صدقہ دیجئے۔ جمعرات کی رات بھاری ہوتی ہے۔''

''پانی حلق سے اُتر جاتا ہے؟''

'' آدمی پہچان لیتے ہیں؟''

یقین جانئے۔ یہ سن کر پانی سر سے گزر جاتا ہے اور میں تو رہا ایک طرف، خود تیماردار میری صورت نہیں پہچان سکتے۔ سرگوشیوں کے دوران ایک دو دفعہ میں نے خود دخل دے کر بقائمیِ ہوش وحواس عرض کرنا چاہا کہ میں بفضلِ تعالیٰ چاق و چوبند ہوں۔ صرف پیچیدہ دواؤں میں مبتلا ہوں۔ مگر وہ اِس مسئلہ کو قابلِ دست اندازیِ مریض نہیں سمجھتے اور اپنی شہادت کی انگلی ہونٹوں پر رکھ کر مجھے خاموش رہنے کا اشارہ کرتے ہیں۔ میرے اعلانِ صحت اور اُن کی پُرزور تردید سے تیمادراروں کو میری دماغی صحت پر شبہ ہونے لگتا ہے۔ یوں بھی بخار سو ڈگری سے اوپر ہوجائے تو میں ہذیان بکنے لگتا ہوں جسے بیگم، اقبالِ گناہ اور رشتے دار وصیّت سمجھ کر ڈانٹتے ہیں اور بچّے ڈانٹ سمجھ کر سہم جاتے ہیں۔ میں ابھی تک فیصلہ نہیں کرسکا یہ حضرت مزاج پُرسی کرنے آتے ہیں یا پُرسا دینے۔ اِن کے جانے کے بعد میں واقعی محسوس کرتا ہوں کہ بس اب چل چلاؤ لگ رہا ہے۔ سانس لیتے ہوئے دھڑکا لگا رہتا ہے کہ روایتی ہچکی نہ آجائے۔ ذرا گرمی لگتی ہے تو خیال ہوتا ہے کہ شاید آخری پسینہ ہے اور طبیعت تھوڑی بحال ہوتی ہے تو ہڑبڑا کر اُٹھ

بیٹھتا ہوں کہ کہیں سنبھالا نہ ہو۔

لیکن مرزا عبدالودود بیگ کا انداز سب سے نرالا ہے۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ اُنھیں میری دلجوئی مقصود ہوتی ہے یا اس میں اُن کے فلسفۂ حیات و ممات کا دخل ہے۔ بیماری کے فضائل ایسے دلنشیں پیرائے میں بیان کرتے ہیں کہ صحتیاب ہونے کو دل نہیں چاہتا۔ تندرستی وبال معلوم ہوتی ہے اور غسلِ صحت میں وہ تمام قباحتیں نظر آتی ہیں، جن سے غالبؔ کوفکرِ وصال میں دوچار ہونا پڑا

کہ گر نہ ہو تو کہاں جائیں، ہو تو کیوں کر ہو

اکثر فرماتے ہیں کہ بیماری جان کا صدقہ ہے۔ عرض کرتا ہوں کہ میرے حق میں تو یہ صدقۂ جاریہ ہوکر رہ گئی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے خالی بیمار پڑجانے سے کام نہیں چلتا۔ اس لیے کہ پسماندہ ممالک میں

فیضان علالت عام سہی، عرفان علالت عام نہیں

ایک دن میں کان کے درد میں تڑپ رہا تھا کہ وہ آنکلے۔ اِس افراتفری کے زمانے میں زندہ رہنے کے شدائد اور موت کے فیوض وبرکات پر ایسی موثّر تقریر کی کہ بے اختیار جی چاہا کہ انہی کے قدموں پر پھڑپھڑاکر اپنی جان جان آفرین کے سپرد کردوں اور انشورنس کمپنی والوں کو روتا دھوتا چھوڑ جاؤں۔ ان کے دیکھے سے میرے تیمارداروں کی منہ کی رہی سہی رونق جاتی رہتی ہے۔ مگر میں سچّے دل سے اُن کی عزّت کرتا ہوں۔ کیونکہ میرا عقیدہ ہے کہ محض جینے کے لیے کسی فلسفہ کی ضرورت نہیں۔ لیکن اپنے فلسفہ کی خاطر دوسروں کو جان دینے پر آمادہ کرنے کے لیے سلیقہ چاہیے۔

چونکہ یہ موقع ذاتی تاثُّرات کے اظہار نہیں۔اس لیے میں مرزا کے اندازِ عیادت کی طرف لوٹتا ہوں۔وہ جب تندرستی کو اُمّ الخبائث اور تمام جرائم کی جڑ قرار دیتے ہیں تو مجھے رہ رہ کر اپنی خوش نصیبی پر رشک آتا ہے۔اپنے دعوے کے ثبوت میں دلیل ضرور پیش کرتے ہیں کہ جن ترقّی یافتہ ممالک میں تندرستی کی وبا عام ہے وہاں پر جنسی جرائم کی تعداد روز بروز بڑھ رہی ہے۔میں کان کے درد سے نڈھال ہونے لگا تو اُنھوں نے مسئلہ مسائل بیان کرکے میری ڈھارس بندھائی:

''' میاں ہمّت سے کام لو۔بڑے بڑے نبیوں پر یہ وقت پڑا ہے۔''

میں درد سے ہلکان ہوچکا تھا۔ورنہ ہاتھ جوڑکر عرض کرتا کہ خدا مارے یا چھوڑے،میں بغیر دعویٰ نبوّت یہ عذاب جھیلنے کے لیے ہرگز تیار نہیں۔علاوہ ازیں،قصص الانبیاء میں نے بچپن میں پڑھی تھی اور یہ یاد نہیں آرہا تھا کہ کون سے پیغمبر کان کے درد کے باوجود فرائضِ نبوی انجام دیتے رہے۔

اس واقعہ کے کچھ دن بعد میں نے ازراہِ تَفَنُّن مرزا سے کہا ''فیرینک ہیرس کے زمانے میں کوئی صاحبِ استطاعت مرد اس وقت تک 'جنٹلمین' ہونے کا دعویٰ نہیں کرسکتا تھا جب تک ہو وہ کم ازکم ایک مرتبہ ناگفتہ بہ جنسی امراض میں مبتلا نہ ہُوا ہو۔یہ خیال عام تھا کہ اس سے شخصیت میں لوچ اور رچاؤ پیدا ہوتا ہے۔''

تمباکو کے پان کا پہلا گھونٹ پی کر کہنے لگے ''خیر! یہ تو ایک اخلاقی کمزوری کی فلسفیانہ تاویل ہے مگر اس میں شبہ نہیں کہ درد اخلاق کو سنوارتا ہے۔''

وہ ٹھیرے ایک جھکّی۔اس لیے میں نے فوراً یہ اقرار کرکے اپنا پنڈ چھڑایا کہ ''مجھے اِس کُلّیہ سے اِتفاق

ہے۔ بشرطیکہ درد شدید ہو اور کسی دوسرے کے اُٹھ رہا ہو۔''

پچھلے جاڑوں کا ذکر ہے۔ میں گرم پانی کی بوتل سے سینک کررہا تھا کہ ایک بزرگ جو آسّی کے پیٹے میں ہیں خیرو عافیت پوچھنے آئے اور دیر تک قبر و عاقبت کی باتیں کرتے رہے۔ جو میرے تیمارداروں کو ذرا قبل اَزوقت معلوم ہوئیں۔ آتے ہی بہت سی دُعائیں دیں، جن کا خلاصہ یہ تھا کہ خدا مجھے ہزاری عمر دے تاکہ اپنے اور ان کے فرضی دشمنوں کی چھاتی پر روایتی مونگ دلنے کے لئے زندہ رہوں۔ اس کے بعد جانکنی اور فشارِ گور کا اس قدر مُفَصّل حال بیان کیا کہ مجھے غریب خانے پر گورِ غریباں کا گمان ہونے لگا۔ عیادت میں عبادت کا ثواب لوٹ چکے تو میری جلتی ہوئی پیشانی پر اپنا ہاتھ رکھا جس میں شفقت کم اور رعشہ زیادہ تھا اور اپنے بڑے بھائی کو (جن کا انتقال تین ماہ قبل اسی مرض میں ہوا تھا جس میں میں مبتلا تھا) یاد کرکے کچھ اس طرح آب دیدہ ہوئے کہ میری بھی ہچکی بندھ گئی۔ میرے لئے جو تین عدد سیب لائے تھے وہ کھا چکنے کے بعد جب انھیں کچھ قرار آیا تو وہ مشہور تعزیتی شعر پڑھا جس میں ان غنچوں پر حسرت کا اظہار کیا گیا ہے جو بِن کھلے مُرجھا گئے۔

میں فطرتاً رقیقُ القلب واقع ہوا ہوں اور طبیعت میں ایسی باتوں کی سہار بالکل نہیں ہے۔ ان کے جانے کے بعد ''جب لاد چلے گا بنجارا'' والا موڈ طاری ہوجاتا ہے اور حالت یہ ہوتی ہے کہ ہر پرچھائیں بھوت اور ہر سفید چیز فرشتہ دکھائی دیتی ہے۔ ذرا آنکھ لگتی ہے تو بے ربط خواب دیکھنے لگتا ہوں۔ گویا کوئی'' کامِک '' یا باتصویر نفسیاتی افسانہ سامنے کھُلا ہوا ہے:

کیا دیکھتا ہوں کہ ڈاکٹر میری لاش پر انجکشن کی پچکاریوں سے لڑرہے ہیں اور لہولہان ہورہے ہیں۔ ادھر کچھ مریض اپنی اپنی نرس کو کلوروفارم سُنگھا رہے ہیں۔ ذرا دور ایک لاعلاج مریض اپنے ڈاکٹر کو یاسین حِفظ کرا رہا ہے۔ ہر طرف

ساگو دانے اور مونگ کی دال کی کھچڑی کے ڈھیر لگے ہیں۔آسمان بنفشی ہورہا ہے اور عُنّاب کے درختوں کی چھاؤں میں، سنا کی جھاڑیوں کی اوٹ لے کر بہت سے غلمان ایک مولوی کو غذا بالجبر کے طور پر معجونین کھِلا رہے ہیں۔تاحدِّ نظر کافور میں بسے ہوئے کفن ہوا میں لہرا رہے ہیں۔جا بجا لوبان سُلگ رہاہے اور میرا سر سنگ مرمر کی لوحِ مزار کے نیچے دبا ہوا ہے او راس کی ٹھنڈک نس نس میں گھسی جارہی ہے۔ میرے منہ میں سگرٹ اور ڈاکٹر کے منہ میں تھر مامیٹر ہے۔ آنکھ کھلتی ہے تو کیا دیکھتا ہوں کہ سر پر برف کی تھیلی رکھی ہے۔میرے منہ میں تھرمامیٹر ٹُھنسا ہوا ہے اور ڈاکٹر کے ہونٹوں میں سگرٹ دبا ہے۔

لگے ہاتھوں، عیادت کرنے والوں کی ایک اور قسم کا تعارُف کرادوں۔یہ حضرات جدید طریق کار برتتے اورنفسیات کا ہر اصول داؤں پر لگادیتے ہیں۔ہر پانچ منٹ بعد پوچھتے ہیں کہ اِفاقہ ہُوا یا نہیں؟ گویا مریض سے یہ توقُّع رکھتے ہیں کہ عالمِ نزع میں بھی اُن کی معلوماتِ عامّہ میں اضافہ کرنے کی غرض سے رَنِنگ کمینٹری کرتا رہے گا۔ ان کی یہ کوشش ہوتی ہے کہ کس طرح مریض پر ثابت کردیں کہ محض انتظاماً بیمار ہے یا وہم میں مبتلا ہے اور کسی سنگین غلط فہمی کی بنا پر اسپتال پہنچا دیا گیاہے۔اُن کی مثال اُس روزہ خور کی سی ہے جو اِنتہائی نیک نیتی سے کسی روزہ دار کا روزہ لطیفوں سے بہلانا چاہتا ہو۔ مکالمہ کا نمونہ ملاحظہ ہو:

ملاقاتی: ماشاء اللہ ! آج منہ پر بڑی رونق ہے۔

مریض: جی ہاں! آج شیو نہیں کیاہے۔

ملاقاتی: آواز میں بھی کرارا پن ہے۔

مریض کی بیوی: ڈاکٹر نے صبح سے ساگودانہ بھی بند کردیاہے۔

ملاقاتی : (اپنی بیوی سے مخاطب ہوکر) بیگما! یہ صحت یاب ہوجائیں تو ذرا انھیں میری پتھری دکھانا جو تم نے چارسال سے اسپرٹ کی بوتل میں رکھ چھوڑی ہے (مریض سے مخاطب ہوکر) صاحب! یوں تو ہر مریض کو اپنی آنکھ کا تنکا بھی شہتیر معلوم ہوتا ہے۔ مگر یقین جانیے، آپ کا شگاف تو بس دوتین انگل لمبا ہوگا، میرا تو پورا ایک بالشت ہے۔ بالکل کھنکھجورا معلوم ہوتا ہے۔

مریض: (کراہتے ہوئے) مگر میں ٹائیفائڈ میں مبتلا ہوں۔

ملاقاتی: (ایکا ایکی پینترا بدل کر) یہ سب آپ کا وہم ہے۔ آپ کو صرف ملیریا ہے۔

مریض: یہ پاس والی چارپائی، جواب خالی پڑی ہے، اس کا مریض بھی اِسی وہم میں مبتلا تھا۔

ملاقاتی: ارے صاحب! مانئے تو! آپ بالکل ٹھیک ہیں۔ اُٹھ کر منہ ہاتھ دھوئیے۔

مریض کی بیوی: (روہانسی ہوکر) دو دفعہ دھوچکے ہیں۔ صورت ہی ایسی ہے۔

اِس وقت ایک دیرینہ کرم فرما یاد آرہے ہیں، جن کا طرزِ عیادت ہی اور ہے۔ ایسا حلیہ بناکر آتے ہیں کہ خود اُن کی عیادت فرض ہوجاتی ہے۔ ''مزاج شریف!'' کو وہ رسمی فقرہ نہیں، بلکہ سالانہ امتحان کا سوال سمجھتے ہیں اور سچ مچ اپنے مزاج کی جملہ تفصیلات بتانا شروع کردیتے ہیں۔ ایک دن منہ کا مزہ بدلنے کی خاطر میں نے ''مزاج شریف!'' کے بجائے ''سب خیریت ہے؟'' سے پُرسشِ احوال کی۔ پلٹ کر بولے ''اِس جہانِ شرّیت میں خیریت کہاں؟'' اس مابعد الطبیعاتی تمہید کے بعد کراچی کے موسم کی خرابی کا ذکر آنکھوں میں آنسو بھر کر ایسے انداز سے کیا گویا ان پر سراسر ذاتی ظلم ہورہا ہے، اور اس کی تمام تر ذمّہ داری میونسپل کارپوریشن پر عائد ہوتی ہے۔

آپ نے دیکھا ہوگا کہ بعض عورتیں شاعر کی نصیحت کے مطابق وقت کو پیمانہ امروز و فردا سے نہیں ناپتیں بلکہ تاریخ و سنہ اور واقعات کا حساب اپنی یادگار زچگیوں سے لگاتی ہیں۔ مذکورالصدر دوست بھی اپنی بیماریوں سے کیلنڈر کا کام لیتے ہیں۔ مثلاً شہزادی مارگریٹ کی عمر وہ اپنے دمے کے برابر بتاتے ہیں۔ سوئز سے انگریزوں کے نہربدر کیے جانے کی تاریخ وہی ہے جو اُن کا پِتّا نکالے جانے کی! میرا قاعدہ ہے کہ جب وہ اپنی اور جُملہ متعلقین کی عدم خیریت کی تفصیلات بتاکر اُٹھنے لگتے تو اطلاعاً اپنی خیریت سے آگاہ کردیتا ہوں۔

بیمار پڑنے کے صدہا نقصانات ہیں۔ مگر ایک فائدہ بھی ہے، وہ یہ کہ اِس بہانے اپنے بارے میں دوسروں کی رائے معلوم ہوجاتی ہے۔ بہت سی کڑوی کسیلی باتیں جو عام طور پر ہونٹوں پر لرز کر رہ جاتی ہیں، بے شمار دل آزار فقرے جو ''خوفِ فسادِ خلق'' سے حلق میں اٹک کر رہ جاتے ہیں، اس زمانے میں یار لوگ نصیحت کی آڑ میں ''ہُوالشّافی'' کہہ کر بڑی بے تکلّفی سے داغ دیتے ہیں۔ پچھلے سنیچر کی بات ہے۔ میری عقل ڈاڑھ میں شدید درد تھا کہ ایک روٹھے ہوئے عزیز جن کے مکان پر حال ہی میں قرض کے روپیہ سے چھت پڑی تھی، لقا کبوتر کی مانند سینہ تانے آئے اور فرمانے لگے:

''میں آپ بھی ضدّی آدمی! لاکھ سمجھایا کہ اپنا ذاتی مکان بنوالیجئے مگر آپ کے کان پر جوں نہیں رینگتی۔''

طعنے کی کاٹ درد کی شدّت پر غالب آئی اور میں نے ڈرتے ڈرتے پوچھا، ''بھائی! میری عقل تو اس وقت کام نہیں کرتی۔ خدارا! آپ ہی بتائیے، کیا یہ تکلیف صرف کرایہ داروں کو ہوتی ہے؟

ہنس کر فرمایا '' بھلا یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے۔ کرائے کے مکان میں تندرستی کیوں کر ٹھیک رہ سکتی ہے۔''

کچھ دن بعد جب انہی حضرت نے میرے گھٹنے کے درد کو بے دودھ کی چائے پینے اور رمی کھیلنے کا شاخسانہ قرار دیا تو

بے اختیار اُن کا سر پیٹنے کو جی چاہا۔

اب کچھ جگ بیتی بھی سن لیجئے۔ جھوٹ سچ کا حال خدا جانے۔ لیکن ایک دوست اپنا تجربہ بیان کرتے ہیں کہ دوماہ قبل اُن کے گلے میں خراش ہوگئی، جو اُن کے نزدیک بدمزہ کھانے اور گھروالوں کے خیال میں سگرٹ کی زیادتی کا نتیجہ تھی۔ شروع میں تو انھیں اپنی بیٹھی ہوئی آواز بہت بھلی معلوم ہوئی اور کیوں نہ ہوتی؟ سنتے چلے آئے ہیں کہ بیٹھی ہوئی (HUSKY) آواز میں بے پناہ جنسی کشش ہوتی ہے۔ خدا کی دین تھی کہ گھر بیٹھے آواز بیٹھ گئی۔ ورنہ امریکہ میں تو لوگ کوکا کولا کی طرح ڈالر بہاتے ہیں جب کہیں آوازمیں یہ مستقل زکام کی سی کیفیت پیداہوتی ہے۔

لہذا جب ذرا افاقہ محسوس ہوا تو انھوں نے راتوں کو گِڑ گِڑا گِڑ گِڑا کر، بلکہ خنخنا خنخنا کر دُعائیں مانگیں:

'' بارِالہا! تیری شانِ کریمی کے صدقے! یہ سوزِش بھلے ہی کم ہوجائے، مگر بھرّاہٹ یونہی قائم رہے۔''

لیکن چند دن بعد جب اُن کا گلا خالی نل کی طرح بھک بھک کرنے لگا تو انھیں بھی تشویش ہوئی۔ کسی نے کہا ''لقمان کا قول ہے کہ پانی پیتے وقت ایک ہاتھ سے ناک بندکرلینے سے گلا کبھی خراب نہیں ہوتا۔''

ایک صاحب نے ارشاد فرمایا ''سارا فتور پھل نہ کھانے کے سبب ہے۔ میں تو روزانہ نہارمنہ پندرہ فٹ گنا کھاتا ہوں۔ معدہ اور دانت دونوں صاف رہتے ہیں۔'' اور ثبوت میں انھوں نے اپنے مصنوعی دانت دکھائے جو واقعی بہت صاف تھے۔

ایک اورخیرخواہ نے اطلاع دی کہ زُکام ایک زہریلے وائرس VIRUS سے ہوتاہے جو کسی دَوا سے نہیں مرتا۔ لہذا جو شاندہ پیجئے کہ انسان کے علاوہ کوئی جاندار اُس کا ذائقہ چکھ کر زندہ نہیں رہ سکتا۔

بقیہ روداد انہی کی زبان سے سنئے :

'' اورجن کرم فرماؤں نے اَزراہِ کسرِ نفسی دوائیں تجویز نہیں کیں، وہ حکیموں اور ڈاکٹروں کے نام اور پتے بتا کر اپنے فرائضِ منصبی سے سبکدوش ہوگئے۔ کسی نے اصرار کیا کہ ' آیورویدک علاج کراو۔' بڑی مشکل سے انھیں سمجھایا کہ میں طبعی موت مرنا چاہتا ہوں۔ کسی نے مشورہ دیا کہ 'حکیم نبّاضِ مِلّت سے رجوع کیجئے۔ نبض پر اُنگلی رکھتے ہی مریض کا شجرۂ نسب بتا دیتے ہیں (اِسی وجہ سے کراچی میں ان کی طبابت ٹھپ ہے) قارورے پر نظر ڈالتے ہی مریض کی آمدنی کا اندازہ کر لیتے ہیں۔' آواز اگر ساتھ دیتی تو میں ضرور عرض کرتا کہ ایسے کام کے آدمی کو تو اِنکم ٹیکس کے محکمہ میں ہونا چاہیے۔

'' غرضیکہ جتنے منہ ان سے کہیں زیادہ باتیں! اور تو اور سامنے کے فلیٹ میں رہنے والی اسٹینوگرافر (جو چُست سویٹر اور جینز پہن کر، بقول مرزا عبدالودود بیگ، انگریزی کا S معلوم ہوتی ہے) بھی مزاج پُرسی کو آئی اور کہنے لگی 'حکیموں کے چکّر میں نہ پڑیئے۔ آنکھ بند کرکے ڈاکٹر دلاور کے پاس جائیے۔ تین مہینے ہوئے، آواز بنانے کی خاطر میں نے اِملی کھاکھاکر گلے کا ناس مار لیا تھا۔ میری خوش نصیبی کہئے کہ ایک سہیلی نے اُن کا پتہ بتا دیا۔ اب بہت اِفاقہ ہے۔'

'' اس بیان کی تائید کچھ دن بعد مرزا عبدالودود بیگ نے بھی کی۔ انھوں نے تصدیق کی ڈاکٹر صاحب امریکی طریقہ سے علاج کرتے ہیں اور ہر کیس کو بڑی توجّہ سے دیکھتے ہیں۔ چنانچہ سینڈل کے علاوہ ہر چیز اُتروا کر انھوں نے اسٹینوگرافر کے حلق کا بغور معائنہ کیا۔ علاج سے واقعی کافی افاقہ ہوا اور وہ اس سلسلے میں ابھی تک پیٹھ پر بنفشی شعاعوں سے سینک کرائے جاتی ہے۔''

مجھے یقین ہے کہ اس طریقۂ علاج سے ڈاکٹر موصوف کو کافی اِفاقہ ہُوا ہوگا۔